شافع قدوائی*

مقبولیت اور فراموشی کے تسلسل کا استعارہ: رتن ناتھ سرشار

Metaphor of Popularity and Forgetfulness: Pandit Rattan Nath Sarshar

Abstract:

While Sarshar and his magnum opus, Fasāna-i +zād, have been the subject of considerable discussion, a thorough and objective assessment of his works, as well as a well-documented account of his life, remains lacking. Does his widely discussed character, Kohji, truly represent the decadent society of Lucknow, or does it transcend our understanding of it? Does Azad's language, often criticised as ornate and contrived, actually explore the profound potential of spoken words? And does Azad's translation of Don Quixote and other texts fall short on several counts? These questions are addressed with documentary evidence, in this article.

Keywords: Oudh Akhbar, Chakbast, Decadent society of Lucknow, Khoji, Don Quixote, Spoken word, multi-sensory prose, and Faiz.

ہمہ گیر اور دیر پا مقبولیت اکثر متعلقہ فن کار کے تفصیلی اور معروضی مطالعے اور تعیّنِ قدر میں حجاب بننے کا امکان رکھتی ہے۔ فن کار کی اجتماعی حافظے میں سرگرم موجودگی، کس طرح اس کے فنی امتیازات، اس کے پیش کردہ مسائل و موضوعات اور اس کے مستند سوانحی کوائف کی جستجو کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے، اس کی ایک مثال پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔

سرشار کی بے مثال تخلیقی ہنر مندی کا اظہار مختلف اصناف ادب میں ہوا۔ داستان، ناول، مزاح، نظم، تراجم اور صحافت کے میدان میں ان کی فنی مہارت، اور علمی اکتسابات کا ذکر ہمیشہ تحسینی پیرائے میں کیا جاتا ہے۔ فسانہ آزاد کو سرشار کے تخلیقی نابغے (Creative genius) کا سب سے بہتر مظہر قرار دیا جاتا ہے جو منشی نول کشور (۱۸۳۶ء-۱۸۹۵ء) کے اخبار اودھ اخبار میں ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء کے درمیان قسط وار شائع ہوا اور پہلی بار کتابی صورت میں ۱۸۸۰ء میں طبع ہوا[1]۔ فسانہ آزاد کو لکھنوی ثقافت و طرزِ معاشرت اور اس عہد کے تصوّرِ حیات، سماجی اور ادبی اقدار کے ایک مرتعش اور پہلو دار بیانیہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہمارے عہد کے چار سر کردہ تخلیق کاروں: محمد حسن عسکری (۱۹۱۹ء-۱۹۷۸ء)، انتظار حسین (۱۹۲۳ء-۲۰۱۶ء)، قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷ء-۲۰۰۷ء) اور شمس الرحمٰن فاروقی (۱۹۳۵ء-۲۰۲۰ء) نے اپنی مختلف تحریروں میں سرشار کو ایسا واحد نثر نگار قرار دیا ہے جس نے تمام اسالیب فنی شعور کے ساتھ آزمائے اور نثر کو تخلیقی اظہار کے سب سے مؤثر وسیلے کے طور پر برتا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز سے ادبی ڈسکورس کا حصہ بنے رہے اور اودھ اخبار میں فسانہ آزاد کی سلسلہ وار اشاعت نے آزاد کو عوام الناس میں بہت مقبول بنا دیا تھا۔ ان سے متعلق کئی تحقیقی مقالے اور کتابیں سپرد قلم کی جاچکی ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں سرشار سے متعلق پہلا تحقیقی مقالہ لطیف حسین ادیب کا ہے، جو پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری کے عنوان سے شائع ہوا[۲]۔ ۱۹۶۴ء میں لندن یونیورسٹی کے School of Oriental and African Studies میں فیروز حسین نے اپنا مقالہ "Life and works of Ratan Nath Sarshar" داخل کیا۔ ۱۲ ابواب اور ۳۰۷ صفحات پر مشتمل تفصیلی اور گراں قدر تحقیقی و تنقیدی مقالہ غالباً اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں پریم پال اشک (پ:۱۹۳۲ء) کی کتاب پنڈت رتن ناتھ سرشار: حیات، شخصیت اور کارنامے اشاعت پذیر ہوئی[۳]۔ یہ کتاب بہت مختصر، محض ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل پریم پال اشک نے پنڈت بشن نرائن در (۱۸۶۴ء-۱۹۲۵ء) کے انگریزی مونوگراف[۴] کا اردو ترجمہ بعنوان سرشار: بشن نرائن در کی نظر میں کیا۔ ۱۵۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں محض ۵۰ صفحات در کی کتاب کا ترجمہ ہیں اور پہلے تین ابواب "میں اور سرشار"، "تمہید" اور "بشن نرائن در" کے عنوان سے ہیں۔ ان صفحات کی تعداد نصف کتاب سے زیادہ ہے۔ ساہتیہ اکادمی نے ہندوستانی ادب کے معمار سیریز میں قمر رئیس (۱۹۳۲ء-۲۰۰۹ء) کا رتن ناتھ سرشار پر مونوگراف شائع کیا[۵]۔ یہ مونوگراف سرشار سے متعلق کوئی نئی اطلاع یا ان کے تنقیدی محاکے کی کسی نئی صورت کو سامنے نہیں لاتا۔ قمر رئیس کو خود بھی اس کا احساس تھا اس لیے انھوں نے مونوگراف کے تمہیدی کلمات میں اعتراف کیا:

> یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ اردو کے بعض دوسرے ممتاز ادیبوں کی طرح سرشار کی زندگی کے بہت سے پہلو پردۂ اخفا میں ہیں۔ ان کے خاندان بچپن، اور لڑکپن کی تعلیم و تربیت کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں ہوتیں۔ میں نے مرزا جعفر حسین[۶] اور لکھنؤ کے بعض ایسے دوسرے بزرگوں سے جنھوں نے سرشار کے معاصرین اور ان کے ورثا کو دیکھا تھا، معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس مقصد میں مجھے کوئی کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر نے سرشار پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جو ۱۹۸۴ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ آداب تحقیق اور تنقیدی مطالعے کے مبادیات سے بڑی حد تک ناواقفیت کی چغلی کھاتا ہے۔ پاکستانی ادیب ڈاکٹر تبسم کاشمیری (پ:۱۹۴۰ء) کی دو کتابیں فسانہ آزاد: ایک تنقیدی جائزہ (۱۹۸۰ء) اور نقد سرشار (۱۹۶۸ء)، مطالعہ سرشار کو یقیناً ایک تحقیقی اور تنقیدی تناظر عطا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرشید صدیقی نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے تراجم پر ایک کتاب سپرد قلم کی جس میں ان کے چار تراجم شمس الضحیٰ، اعمال نامہ روس، الف لیلہ اور خدائی فوجدار کو مرکز مطالعہ بنایا گیا

ہے^۸۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے فسانہ آزاد سے متعلق ایک تفصیلی فرہنگ مرتب کی جو مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے ۱۹۹۴ء میں شائع کی۔ یہ فرہنگ ۴۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی (۱۹۱۳ء-۱۹۷۸ء) نے آزاد کے شہرہ آفاق کردار ''خوجی'' سے متعلق فسانہ آزاد میں شامل اقتباسات کی وساطت سے ایک متن تیار کیا جو ۱۹۵۷ء میں خوجی کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو کے تمام اہم ناقدین بشمول احسن فاروقی (۱۹۱۳ء-۱۹۷۸ء)، محمد حسن عسکری، کلیم الدین احمد (۱۹۰۹ء- ۱۹۸۳ء)، احتشام حسین (۱۹۱۲ء-۱۹۷۲ء)، آل احمد سرور (۱۹۱۱ء-۲۰۰۲ء)، علی عباس حسینی (۱۸۹۷ء-۱۹۶۹ء)، وزیر آغا (۱۹۲۲ء-۲۰۱۰ء)، گوپی چند نارنگ (۱۹۳۱ء-۲۰۲۲ء)، وارث علوی (۱۹۲۸ء-۲۰۱۴ء) اور خورشید الاسلام (۱۹۱۹ء-۲۰۰۶ء) وغیرہ نے سرشار سے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔

اردو زبان اور ادب کی انگریزی زبان میں شائع ہونے والی تاریخیں جو رام بابو سکسینہ (۱۸۹۶ء-۱۹۵۷ء)، ٹی گراہم بیلی (۱۸۷۲ء-۱۹۴۲ء)، ڈاکٹر محمد صادق اور علی جواد زیدی (۱۹۱۶ء-۲۰۰۴ء) کی تصنیف کردہ ہیں، سرشار کو موضوع بحث بناتی ہیں۔ سرشار سے متعلق کتابوں اور مقالوں میں سب سے زیادہ قابل قدر کام فیروز حسین کا ہے، جس کا ذکر گزشتہ سطور میں آ چکا ہے۔ سرشار پر لکھنے والے کسی اردو مصنف نے شاید ہی اس مقالے کے اندراجات کا ذکر کیا ہو۔ مقالے میں سرشار سے متعلق انتہائی اہم سوانحی تفصیلات اور تنقیدی محاکمے پر کسی اردو ناقد نے توجہ نہیں دی۔ اس لحاظ سے اس مقالے پر بڑی حد تک فراموش کاری کی گہری دھند مستولی ہے۔ گو کہ یہ انٹرنیٹ پر دستیاب ہے؛ اس کے اردو ترجمے کی اشاعت کی اشد ضرورت ہے کہ اس سے سرشار فہمی کی ایک نئی روایت پروان چڑھ سکتی ہے۔

سرشار سے متعلق کتابوں کے اجمالی تذکرے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار اردو کے حاوی تنقیدی اور ادبی ڈسکورس کا حصہ بنے رہے اور انھیں عوام میں قابلِ لحاظ مقبولیت بھی حاصل رہی مگر ان سے متعلق مستند سوانحی کوائف، تصانیف کی مکمل فہرست، ملازمت کی تفصیل اور ان کے ادبی سرمائے کی معروضی اور تفصیلی تعیّنِ قدر سے اردو ادب کی تاریخ بڑی حد تک تہی ہے۔ سرشار کے انتقال کے معاً بعد برج نرائن چکبستؔ (۱۸۸۲ء-۱۹۲۶ء) کا مضمون ''پنڈت رتن ناتھ در۔ سرشار'' کشمیر درپن، مئی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا جس میں انھوں نے سرشار کے سوانحی کوائف سے متعلق مستند اطلاعات کے فقدان پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا:

> اہل کشمیر میں دو صاحب ایسے گزرے ہیں جن کی شہرت کا دامن قیامت کے دامن کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ ایک پنڈت دیا شنکر نسیم جن کے فیض سے چمنستان نظم کو شادابی حاصل ہوئی، دوسرے حضرت سرشار۔ انھوں نے حدیقۂ نثر میں نئی روشیں نکالیں اور جن کی جادو بیانی کا شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے مگر واہ رے بے ہمتی کہ ایسے باکمال کی زندگی کے حالات کا پتہ چلنا ہمارے لیے دشوار ہے۔ اور پھر ایسی حالت میں، جب کہ ان کو اس دنیا سے اٹھے ہوئے کچھ عرصہ نہیں گزرا، دریافت کیے جانے پر سالِ ولادت نہ معلوم ہو سکا۔ اندازاً یہ

معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے تو محمد علی شاہ کا آخری دور تھا[9]۔

سلطنت اودھ کے نویں فرماں روا محمد علی شاہ ۶۳ سال کی عمر میں گدی نشیں ہوئے اور یہ ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۲ء تک گدی نشیں رہے[10]۔ چکبست کے اندازے کے مطابق سرشار محمد علی شاہ کے پانچ سالہ دورِ حکومت کے آخری دور یعنی ۴۰ سے ۴۲ کے درمیان پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال ۱۹۰۳ء میں ۵۵ سال کی عمر میں ہوا جو درست نہیں۔ اس حساب سے سرشار کی عمر ۶۱ برس ہونی چاہیے تھی۔

چکبست کا مذکورہ بالا مضمون مطالعاتِ سرشار کا بنیادی ماخذ ہے اور ان کے سوانحی کوائف اور دیگر تفصیلات، حوالے اور اکثر حوالے کے بغیر (یہ اردو کے مضمون نگاروں کی عام روش ہے) اسی مضمون سے اخذ کی جاتی ہیں۔ رام بابو سکسینہ، پریم پال اشک، سید لطیف حسین (پ: ۱۹۳۱ء)، اور قمر رئیس وغیرہ نے ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء کو سرشار کا سالِ ولادت قرار دیا ہے۔ سرشار کے سالِ ولادت کا حتمی طور پر تعین نہیں ہو سکا ہے۔

سرشار کی رسمی تعلیم سے متعلق اطلاعات نامکمل اور ناقص ہیں۔ سرشار جب چار برس کے تھے تو ان کے والد پنڈت بیج ناتھ در کا انتقال ہو گیا اور چکبست کے مطابق: انھوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم دستورِ قدیمہ کے مطابق پائی۔ پریم پال اشکؔ نے اس ضمن میں لکھا:

> سرشار بڑے ہوئے تو انھیں عربی اور فارسی تعلیم کے لیے لکھنؤ کے مکتب میں بھیج دیا گیا۔ چوں کہ وہ نوابی عہد تھا، اس لیے انھیں تعلیم بھی قدیم دستور کے مطابق دی گئی[11]۔

پریم پال اشک نے سرشار کی تعلیم سے متعلق کوئی متعین اطلاع نہیں دی اور چکبست کے مضمون کو خفیف سی لفظی تحریف کے ساتھ پیش کرنے پر اکتفا کیا۔

قمر رئیس کا مونوگراف رتن ناتھ سرشار بھی اس ضمن میں کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ وہ لکھتے ہیں:

> پانچ چھ سال کی عمر میں وہ جب دستور فارسی اور عربی کی تعلیم کے لیے ایک مکتب میں داخل ہوئے، اس مکتب میں محلہ کے مسلمان اور ہندو بچے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے[12]۔

سرشار مکتب کے بعد کس اسکول میں داخل ہوئے، اس باب میں سرشار کے سوانح نگار خاموش ہیں۔ اولاً چکبست اور پھر ان کے بعد پریم پال اشک اور قمر رئیس نے سرشار کے کیننگ کالج میں داخلے کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے یہاں سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ اگر ۱۸۴۶ء کو سرشار کا سالِ ولادت تسلیم کر لیا جائے؛ اور وہ مکتب کی تعلیم کے بعد کیننگ کالج داخل ہوئے تھے تو ان کی عمر ۲۱ برس ٹھہرتی ہے۔ کیننگ کالج کا افتتاح سر جان لارنس (۱۸۱۱ء-۱۸۷۹ء)[13] نے ۱۳ نومبر ۱۸۶۷ء کو کیا تھا اور ۱۹۲۰ء میں اسے یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا جو لکھنؤ یونیورسٹی کے نام سے معروف ہے۔ کیننگ کالج سے سرشار کی وابستگی کی

نوعیت کیا تھی۔ وہ کس کلاس میں ۲۱ برس کی عمر میں داخل ہوئے اور انھوں نے یہاں کتنا عرصہ گزارا، اس کا کوئی ذکر کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ ۱۸۷۶ء میں سرشار کھیری کے ایک اسکول میں مدرس ہوئے، اس کی بھی تفصیل موجود نہیں ہے۔

سوانحی کوائف کے مستند اندراج سے مطالعات سرشار کے صفحات بڑی حد تک عاری ہیں اور کچھ اسی نوع کی، افسوس ناک صورت ان کی تصانیف کی بھی ہے۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف فسانہ آزاد سمیت دیگر ناولوں، تراجم اور صحافتی اکتسابات کے مرکوز اور خیال انگیز مطالعے اور ان کے متون کے گہرے تجزیے کا مرحلہ ہنوز طے نہیں ہو سکا ہے۔ فسانہ آزاد چار جلدوں[۱۴] پر مشتمل ہے، جن کی مجموعی ضخامت تین ہزار سے زائد صفحات ہے مگر فسانہ آزاد کے متعلق جن امور کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے، ان کا تعلق پہلی جلد سے ہے، اور بقیہ تین جلدوں میں مندرج واقعات اور متعدد دیگر کرداروں کا تذکرہ شاذ ہی کیا جاتا ہے۔ فسانہ آزاد کو ''آزاد'' اور ''خوجی'' کے کرداروں پر استوار سمجھا جاتا ہے مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ پہلی جلد کے صفحہ ۱۵۲ پر پہلی بار خوجی کا کردار متعارف ہوتا ہے۔ شروع کے سو صفحات پر آزاد، چھمی جان، نواب امین الدین حیدر اور رنگے سیار وغیرہ کا ذکر ہے۔

اس امر سے بھی واقفیت عام نہیں ہے کہ فسانہ آزاد اوّلین صورت میں اودھ اخبار میں شائع ہونا شروع ہوا۔ سرشار نے اس اخبار میں ''ظرافت'' کے عنوان سے کالم، ۱۷ اگست ۱۸۷۶ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اسی کالم سے فسانہ آزاد طلوع ہونا شروع ہوا۔ اودھ اخبار کی متعدد فائلیں مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دستیاب ہیں۔ سرشار نے اپنے اوّلین کالم میں امتحان میں ناکام رہنے والے ایک طالب علم اور اسکول ماسٹر کے مابین مکالمے کو ایک مزاحیہ خاکے کی صورت میں پیش کیا ہے[۱۵]۔

فسانہ آزاد کے ابتدائی صفحات دو کرداروں: آزاد اور چھمی جان کو قائم کرتے ہیں، ان کے افعال و اعمال سے ایک کثیر حسی بیانیہ خلق کیا گیا ہے۔ درج ذیل عبارت میں، بصری، صوتی، اور دیگر حواس کی مدارات کا اہتمام کیا گیا ہے۔

> سحر کاذب کے وقت، مرغِ بے ہنگام نے گربہ مسکین کی آہٹ جو پائی تو گھبرا کر ککڑوں کوں کی بانگ لگائی اور ہمارے حبیب لبیب، دقیقہ رس، صبح نفس، جو سرِ شام سے لمبی تانے میٹھی نیند سو رہے تھے، یہ آوازِ خوش آئند سنتے ہی کلبلا کر اٹھ بیٹھے۔ اِدھر آنکھ کھلی اُدھر باچھیں کھل گئیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ابرِ نو بہار، نسیم مشک بار نے تمام شہر کو نمونۂ گلزارِ ارم بنا دیا ہے۔ یہ شاعر آدمی حسن پرست، وارفتہ مزاج، رنگیں طبع، آزاد منش، تاب کہاں کہ مکان کے قفس میں قید رہیں؛ بوئے گل کی طرح نکل کھڑے۔ روشنی طبع کے صدقے، ایک ایک قدم پر ایک مصرعِ ریختہ موزوں ہوتا جاتا تھا۔ یہاں داد کون دے، خود ہی گردن ہلاتے جاتے تھے اور احسنت اور مرحبا وغیرہ کلمات زباں پر لاتے تھے اور خود ہی جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ الغرض ہمارے

دھن کے پکے حبیب مجذوبوں کی قطع بنائے چلے جاتے تھے کہ دو مختلف اوضاع حضرات نظر سے گزرے۔ ایک صاحب وضع دنیا سے نرالے، پتلون خاکی، جاکٹ کالی، کوٹ پیلا، ویس کوٹ ڈھیلا، گھنی ڈاڑھی، خرگوش کی جھاڑی، ہاف بوٹ پہنے کھٹ پٹ کرتے چلے آتے ہیں۔ دوسرے ایک بڑے بزرگوار اور زیبا اندام، نازک خرام، گلفام، دھانی رنگ کا کرتا، اس پر روپے گز والی مہین شربتی کمر توئی کا چست انگرکھا۔ گلبدن کا چوڑا گھٹنا پہنے، بیواؤں کی طرح دوپٹیاں جمائے، عطر عروس لگائے، ٹکے دار ماشہ بھر کی ننھی سی ٹوپی اٹکائے، ہاتھوں میں مہندی، پور پور چھلے، آنکھوں میں سرمہ کی تحریر، چھوٹے پنجے کا زرد مخملی چڑھوان جوتا، زیبِ پا کیے ہوئے، ایک عجیب لوچ سے کمر لچکاتے، پھونک پھونک کر قدم دھرتے چلے آتے تھے۔ اُنھوں نے اِن کو اور اِنھوں نے اُن کو خوب غور سے گھورا اور ہمارے حبیب لبیب، چتون سے تاڑ گئے کہ دونوں دھن کے پکے ہیں۔ اتنے میں حضرت نازک بدن (ان کا نام چھمی جان ہے) نے آواز دی۔"[16]

فسانہ آزاد جلد اول کا بارھواں ایڈیشن پیش نظر ہے جس کے سرورق پر لکھا ہے:

فسانہ آزاد جلد اوّل، اس اردو ناول سے ناظرین کو مہذب ظرافت کے پیرایہ [پیرائے] میں عمدہ اخلاقی نتیجے [نتائج] حاصل ہوتے ہین [ہیں]۔ حسب الایمائے منشی نولکشور صاحب سی ای مرحوم بانی مبانی مطبعِ ہذا پنڈت رتن ناتھ صاحب در کشمیری لکھنوی نے تصنیف فرمایا۔ یہ فسانہ ... ابتدائے دسمبر ۱۸۷۸ء لغایت دسمبر ۱۸۷۹ء شائع ہوتا رہا۔ اُسکے [اس کے] بعد سے ابتک [اب تک] بسبب ہر دلعزیزی [ہر دل عزیزی] بحیثیت کتابی چار جلدو نمیں [جلدوں میں] سات مرتبہ طبع و شائع ہو چکا ہے۔ اب حسب الحکم منشی بشن نرائن صاحب بھارگو مالک مطبع باہتمام [بااہتمام] سیٹھ کیسری داس سپرنٹنڈنٹ بار ہشتم مطبع نامی منشی نولکشور مین [میں] چھپا"[17]۔

شافع قدوائی ۱۰۲

فسانہ آزاد، اودھ اخبار میں قسط وار چھپا اور پھر اسے کتابی شکل عطا کی گئی، لہٰذا فسانہ آزاد میں مصنف کی جانب سے کوئی تحریر شامل اشاعت نہیں ہے جس سے مصنف کے نقطۂ نظر، قصہ لکھنے کے مقصد یا اس کے بنیادی سروکاروں کا اندازہ لگایا جاسکے مگر کتابی صورت میں اشاعت سے قبل جب اودھ اخبار میں فسانہ آزاد کالم "ظرافت" کے عنوان سے شائع ہو رہا تھا تو سرشار نے اپنے مقصد کی صراحت کرتے ہوئے لکھا تھا:

اس سے اصل مقصد ہمارا یہ ہے کہ ناظرین اودھ اخبار بہ پیرایۂ ظرافت و طرزِ معاشرت، تعلم، مذاق و بول چال اور موقع مناسب کے محاورات اور ہر قسم کی صحبتوں کی کیفیت و طرزِ معاشرت سے کلیۃً واقفیت نامہ حاصل کریں۔ نیک خیالات اور اخلاقِ حسنہ سے لوگوں کے دل منوّر اور خیالاتِ فاسدہ اور خصائلِ رذیلہ کی تاریکی سے پاک ہوں اور کامل فیض ایک معقول تربیت سے راستی پسند طبیعتوں کو ہو۔ ان کو پڑھ کر بد لحاظ

زباں دانی اور بد خیال عمدہ مقاصد اور لطف مذاق اور زندہ دلی حاصل کریں[۱۸]۔

منشائے مصنف سے کسبِ فیض کرنے کے خوگر ناقدین نے بھی فسانہ آزاد کے بارے میں سرشار کی رائے کو حرفِ آخر کے طور پر تسلیم کیا۔ فسانہ آزاد کے بارے میں اس تصوّر کو عام کیا گیا کہ سرشار نے لکھنوی طرزِ معاشرت، یہاں کی مذہبی تقریبات، معاشرتی آداب ورسوم، تیوہاروں اور ادبی تقریبات کے فن کارانہ شعور کے ساتھ مرقع کشی کی ہے۔ اس کا مقصد قارئین کی ثقافتی اور جذباتی تسکین کرنا تھا۔ فسانہ آزاد میں لکھنؤ کے علاوہ بمبئی اور بیرونِ ہند کے اسفار، اور روس اور ترکی کی جنگ جیسے موضوعات کو بھی برتا گیا ہے۔ اور قصّے کی تمام جہتیں آزاد اور خوجی کے کرداروں کی پہلودار اور سرگرم شرکت سے آشکار کی گئی ہیں اور واقعات ایک حسّی تجربے کے طور پر منقلب ہوتے ہیں۔

سرشار کی ادبی وفنی قدر وقیمت کے تعیّن میں ناقدین نے عموماً عمومی اور تحسینی انداز اختیار کیا ہے اور متن کے خیال انگیز تجزیے کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ سرشار کا متن حیرت انگیز طور پر متنوع ہے اور مختلف موضوعات پر ان کی ماہرانہ دسترس اور پھر فنی پیش کش پر مہارت کو آشکار کرتا ہے۔ اسے صرف لکھنؤ کی معاشرت تک محدود کر دینا تنقیدی سہل انگاری کے سوا کچھ نہیں۔ سرشار کی تحریروں کو عموماً خوش طبعی، ظرافت، جنسی پیش قدمیوں، معرکہ آرائیوں اور رنگین بیانی سے عبارت سمجھا جاتا ہے۔ آزاد کی رومانی فتوحات، تمنائی معاشقوں اور خواتین کرداروں مثلاً حسن آرا، سپہر، اللہ رکھی، مائدہ اور کلارسا کے آزادانہ اختلاط (Promiscuity) کے رویّے کو فسانہ آزاد کی امتیازی صفت گردانا جاتا ہے۔ چوں کہ فسانہ آزاد، اودھ اخبار میں قسط وار اشاعت پذیر ہوا، اس لیے اخبار کے قارئین کے ذوق کا خاص خیال رکھا گیا یعنی اس متن کا بنیادی مقصد قارئین کو خوش وقت کرنا تھا۔ اس اعتبار سے سرشار کے متن کو یک رخا اور دل چسپی کے بیش از بیش عناصر سے مزیّن سمجھا گیا اور مصنف کی تفہیم کو ایک سریع الفہم عمل قرار دیا گیا۔

سرشار کی تخلیقی انفرادیت کا بنیادی رمز کیا ہے؟ کیا فسانہ آزاد لکھنوی تہذیب کے امتیازات کو موضوع بحث بناتا ہے اور کیا آزاد کا متن زندگی کے بنیادی سروکاروں کو پس پشت ڈال کر اودھ کی طرزِ بُود وباش، مذہبی رسوم، آداب طعام، معاشرتی آداب، دل بستگی کے عمومی ذرائع، اہم عمارات اور مظاہرِ فطرت کی عکاسی کو مقصود جانتا ہے؟ کیا فسانہ آزاد صرف لکھنؤ کے زوال آمادہ کلچر کے مختلف مظاہر کو فنی معروض کے طور پر پیش کرتا ہے؟ فسانہ آزاد کی چار جلدوں پر بہ یک وقت نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرشار نے لکھنؤ کو ایک تخیلی شہر (Imagined city) کے طور پر برتا ہے اور جس کلچر کو اپنے تخلیقی تگ و تاز کا محور بنایا ہے وہ بنیادی طور پر 'عوامی ثقافت' ہے اس ضمن میں اصغر ندیم سید (پ: ۱۹۵۰ء) نے سرشار سے متعلق غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیمینار کے ایک آن لائن سیشن میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ یہ ہے کہ عوامی کلچر کبھی زوال آمادہ نہیں ہوتا۔ امرا اور

متوسط طبقے کی ثقافت زوال پذیر ضرور ہوتی ہے۔ عوامی کلچر کو زوال نہیں کہ یہ عام انسانوں کا طریقۂ زیست ہے۔ سرشار نے روزمرہ کے واقعات اور عوام کے تجربات اور احساسات کو طبقۂ امرا کے بعض نمائندہ کرداروں کے افعال اور اعمال کے حوالے سے بیان کر کے اپنی تخلیقی فطانت کے اَن مِٹ نقوش مرتسم کیے اور زمانی تجربہ کو ایک ماورائی جہت عطا کی ہے۔ سرشار نے اصل لکھنؤ کو ایک حسی وقوعہ کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کی مرقع کشی کی ہر صورت حواس پر ایک تجربہ کے طور پر وارد ہوتی ہے۔

رجب علی بیگ سرورؔ(۱۷۸۶ء-۱۸۶۹ء)، مرزا محمد ہادی رسواؔ(۱۸۵۷ء-۱۹۳۱ء)، عبدالحلیم شررؔ(۱۸۶۰ء-۱۹۲۶ء) اور مرزا جعفر حسین (۱۸۹۹ء-۱۹۸۸ء) کے ہاں لکھنؤ کے معاشرتی، مذہبی اور ادبی منظر نامے کو براہِ راست پیش کرنے کا رجحان عام ہے۔ لکھنؤ کی مخصوص ثقافت کے امتیازات، شفاف بیانیے میں ملفوف ہیں اور اس اعتبار سے فسانہ عجائب، امراؤ جان ادا، شریف زادہ، گذشتہ لکھنؤ، اور قدیم لکھنؤ کی آخری بہار کے مطالعے سے اس سوال کا جواب بڑی آسانی سے مل جاتا ہے کہ لکھنوی تہذیب کے امتیازی عناصر کیا تھے اور ان ترکیبی عناصر کے بیانیہ کی سطر سطر سے لکھنؤ کے اوصاف عیاں ہوتے ہیں۔ اس کے علی الرغم سرشار کے یہاں بیان کی نوعیت، سیال اور حسّی ہے یعنی لکھنؤ کی تہذیب کو کسی متعین محاورے یا پیرایۂ اسلوب (Formulated phrase) کے حوالے سے بیان نہیں کیا جا سکتا ہے، سرشار نے کوشش کی کہ لکھنؤ کی معاشرت اور تہذیب کے تمام مظاہر کو محض طبقہ اشرافیہ کی مخصوص اخلاقیات یا پیرایۂ زیست کے حوالے سے بیان نہ کیا جائے کہ اس سے اکثر بیانیہ کے سپاٹ یا عملی طور پر متوقع (Predictable) ہونے کا خدشہ تھا۔ سرشار محض لکھنوی تہذیب کے حدی خواں، پرجوش حمایتی اور اس کے زوال کے نوحہ خواں نہیں تھے بلکہ وہ عوامی آرزومندیوں اور اپنے عہد کے اہم دانش ورانہ سماجی اور سیاسی نظریات سے بھی گہرا سروکار رکھتے تھے۔ انسان گہرا مذہبی شعور رکھنے کے باوجود اور قادرِ مطلق کی اطاعت کا دعویٰ کرنے کے باوجود، کیسے اپنے عمل سے اس کی تکذیب کرتا ہے اور اپنے فعل سے خدا کو فریب دینے کی انسانی سرشت کے مختلف واقعات سرشار نے بکثرت بیان کیے۔ اس نوع کی انسانی کمزوری (wickedness) فسانہ آزاد کے ایک کردار "شرف" کے مکالمے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

> شرف: حضرت ایک لطیفہ بندے کو بھی یاد آ گیا، ایک تذکرے میں نظر سے گزرا، ایک رندسی آشام [رندے آشام] نے وقتِ نزع اپنے احباب کو یہ وصیت کہ یارو ہمپر [ہم پر] اتنا احسان کرو کہ کہیں سے باوا آدم کے وقت کا پرانا دھرانا، سڑا گلا، کفن لا رکھو۔ جب ہم دم توڑیں تو اسی کفنِ کہنہ میں لپیٹ کر ہمیں گور میں دفنا دینا۔ لوگ متحیر ہوئے کہ یہ عجب انوکھی بات ہے۔ پوچھا اس سے فائدہ؟ حضرت نے آہِ سرد بھر کر بہ صد حزن وملال، زیرلب کہا کہ بھئی تمام عمر پرلے سرے کے بدمعاش، آوارہ اور عیاش رہے۔ یادِ الٰہی سے طبیعت نفور تھی۔ ممنوعات اور معصیات سے بالکل اجتناب نہ کیا، خوب شراب لنڈھائی، خود بھی پی اوروں کو بھی پلائی۔ دن رات بتوں ہی کے کوچے میں پڑے رہے۔ نماز کے قریب نہ پھٹکے... اب ہم سوچتے ہیں کہ بار خدایا ہمارا

سرانجام کیا ہوگا۔ ہیں تو ہم اسی قابل کہ نارِ جہنم میں جلائے جائیں مگر ایک تدبیر سوجھ گئی، پرانے کفن میں ہماری نعش ہوگی۔ منکر نکیر آئیں گے۔ کفنِ کہنہ دیکھ کر سمجھیں گے کہ مردہ دیرینہ ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیں گے ہم اسی حیلے سے نجات پائیں گے[19]۔

فسانہ آزاد کے صفحات، صحبتِ اربابِ نشاط یا بزم آرائیوں، رقص و سرود کی محفلوں، میلوں ٹھیلوں یا شعر و سخن کے نکات کی تشریح سے مزیّن نہیں ہیں، نہ اس میں نئے علوم اور نئی تبدیلیوں، کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ معاشرے کی بدلتی ہوئی قدروں اور عوام کے مذاقِ سخن میں آنے والی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہا گیا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں اردو اخبارات کی اشاعت کلکتہ سے شروع ہوئی[20] اور پھر ملک کے طول و عرض سے نہ صرف انگریزی بلکہ اردو اور دیگر زبانوں میں اخباروں کی اشاعت شروع ہوئی اور انھیں قبولِ عام حاصل ہوا۔ فسانہ آزاد کے مرکزی کردار ”آزاد“ جس کا زیادہ تر وقت آوارہ گردی میں گزرتا ہے، اخبار کی اہمیت سے واقف ہے اور اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

تو قبلہ آپ نے اخبار پڑھا ہی نہیں۔ پیر و مرشد! اخبار عطر مجموعہ ہے۔ لڑکوں کا اتالیق، جوانوں کا ناصح شفیق، بڑھوں کے تجربہ کی کسوٹی، رکن رکین سلطنت، تجار کا دوست، صناعوں کا یارِ غار، رعایا کا وکیل، جمہور انام کا سفیر، مدبروں کا مشیر، کسی کالم میں ملکی چھیڑ چھاڑ، کہیں سوشل امور میں تکرار، کہیں اشعارِ آب دار، کہیں نوٹس اور اشتہار۔ انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں درج ہوتی ہیں اور دیسی اخبار بھی ان کا تتبع کرتے ہیں۔ شطرنج کے حل مطلب [حل طلب] نقشے، قرض قومی کا نرخ، گھوڑ دوڑ کا تذکرہ، سب ہی کچھ ہوتا ہے[21]۔

فسانہ آزاد یقیناً سرشار کا ناقابل فراموش ادبی کارنامہ (Magnum Opus) ہے اور عام تصوّر کے (جس کی ترویج میں ناقدین کا کردار اہم ہے) برعکس سرشار نے کسی مخصوص شہر یا خطہ ارض کی ثقافت، مذہبی تصوّرات، رسومیات، اور رومانی واقعات و جنسی پیش قدمیوں اور فتوحات کے پہلو دار بیان تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ معاشرتی تبدیلیوں اور اصلاحی مقاصد کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ فسانہ آزاد، آزاد اور خوجی کی رنگین مہم جوئی کی داستانِ دل فریب نہیں ہے بلکہ فسانہ آزاد اصلاحی اور اخلاقی تصوّر کائنات کی فنی تمثیل بھی ہے[22]۔ نذیر احمد کو اخلاقی اور اصلاحی بیانیے کا موجد کہا جاتا ہے مگر فسانہ آزاد کی چار جلدوں (علی عباس حسینی کی استثنائی مثال سے قطع نظر) سے براہِ راست استنباط کی مثالیں اردو ناقدین کے ہاں شاذ ہی ملتی ہیں اور اقتباسات بھی پہلی جلد سے ہی دیے جاتے ہیں مگر فسانہ آزاد کے مکمل متن کے مطالعے سے منکشف ہوتا ہے کہ یہ ناول رومان، معرکہ آرائیوں، مہم جوئی، اور مقصد کے حصول کے لیے ممکنہ تمام قربانیاں پیش کرنے کے مختلف واقعات کو ایک مرکزی حوالے سے پیش کرتا ہے اور یہ حوالہ انسان کی جنسی بے راہ روی نہیں ہے اور نہ فسانہ آزاد لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کی مرقع کشی سے عبارت ہے۔ سرشار کا ناول، بلند تر اصلاحی اور اخلاقی مقاصد کے محور پر گردش کرتا ہے گو کہ اس سے غیر ملکی تسلط کی حمایت اور مغربی طرزِ حیات سے مرعوبیت

کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سرشار کے ناصحانہ نقطۂ نظر کا ذکر بہت کم کیا جاتا ہے۔ فسانہ آزاد کی اشاعت کا سلسلہ جب شروع ہوا تو انگریزی حکومت کا دبدبہ قائم ہو چکا تھا اور انگریزوں کے فوجی، تعلیمی، معاشرتی، علمی اور ادبی بیانیے نے ہندوستانی اسلوبِ زیست کو سرنگوں کر دیا تھا۔ ضعیف الاعتقادی، اندھی عقیدت، توہمات، تعصبات، صنفی تفریق، عدم مساوات، اور احساس تفاخر کے بے معنی اظہار پر مبنی بیانیے کی شکست لازمی تھی۔ سرشار عورتوں کے تئیں ناروا سلوک اور مرد اساس معاشرے کے غیر انسانی رویّے سے حد درجہ نالاں تھے اور اس کا اظہار ناول کے صفحات پر تواتر اور شد و مد کے ساتھ ہوتا ہے مگر اسے توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ اس وقت یورپ میں بھی ادب کے افادی نقطۂ نظر کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور تلقینی ادب (Didactic Literature) کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نوع کے ادب میں تلقینی لہجے سے کام لیا جاتا ہے اور معنی کی ترسیل براہِ راست کی جاتی ہے۔ فلسفیانہ اور اخلاقی موضوعات کو قصوں کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ قدیم یونان کی کہانیاں جسے Aesop Fables کہا جاتا ہے، اس کی سب سے قدیم مثال ہے۔ مختصر کہانیاں اخلاقی مقاصد کی تابع ہوتی تھیں۔ سترھویں صدی میں جان بنیان (John Binyan۔ ۱۶۲۰ء-۱۶۸۸ء) کا تمثیلی ناول *The Pligrim's Progress* (۱۶۷۸ء)، اور اٹھارویں صدی میں جانتھن سوئفٹ (Jonathan Swift۔ ۱۶۶۷ء-۱۷۴۵ء) کا طنزیہ متن *Gulliver's Travels* (۱۷۲۶ء) اس نوع کے ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔

فسانہ آزاد پر 'تلقینی ادب' کے گہرے سائے لرزاں ہیں اور اس کا مطالعہ ایک اخلاقی تصوّرِ کائنات کی تمثیل کی صورت میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کا نام، آزاد، موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ایک شخص کی داستانِ حیات ہے جو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہے اور رسمی ضابطۂ اخلاق کا اسیر نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ مختلف عورتوں سے روابط استوار کرتا ہے اور اس کا طرزِ زیست، عام معاشرتی آداب کا تابع نہیں ہے۔ لکھنؤ کے علاوہ بمبئی، ترکی، پولینڈ اور روس کی خواتین سے ارتباط کی داستان کو کسی اصلاحی یا اخلاقی مقصد کی ترویج کے وسیلے کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا، مگر اخلاقی زندگی سے انحراف کے طور پر ضرور سمجھا جاسکتا ہے۔ فسانہ آزاد کی تمام جلدوں علی الخصوص چوتھی جلد جو ایک ہزار سے زائد صفحات کو محیط ہے، کے مشمولات سے مترشح ہوتا ہے کہ سرشار نے ہندوستان میں رائج توہمات، جہالت اور صنفی تعصب کے خلاف، صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ عورتوں کی زبوں حالی اور پدر سری معاشرے کی چیرہ دستیوں کا ذکر سرشار کے یہاں تواتر کے ساتھ ہوتا ہے۔ فسانہ آزاد میں موجزن اصلاحی جذبہ توبتہ النصوح، ابن الوقت، شریف زادہ اور مراۃ العروس سے کہیں زیادہ تاثر انگیز ہے۔ عورتوں کو زیور تعلیم سے آراستہ نہ کرنا اور پھر یہ جواز پیش کرنا کہ عورتیں تعلیم حاصل کرکے نامحرموں کو خطوط لکھنے لگیں گی، سرشار کو منظور نہیں تھا، فسانہ آزاد کے ایک کردار کا اس پر ردِّ عمل ملاحظہ کریں:

افسوس کی بات ہے کہ ہمارے وطن مالوف کی نسواں پڑھی لکھی نہیں ہوتیں اور ان کی جہالت، ہماری ترقی کے ساتھ وہ کرتی ہے جو سانپ کا زہر انسان کی جان کے ساتھ کرتا ہے۔ گنواروں کی عورتیں تو خیر یہ کہہ کر بری ہو جائیں گی کہ ہمارے میاں، باپ، بھائی، گاؤں کے مرد خود ہی ان پڑھ ہوتے ہیں تا بہ نسواں چہ رسد مگر جو اصحاب، تربیت یافتگی اور لیاقت کا دم بھرتے ہیں وہ اس جرم سے ہرگز ہرگز بری نہیں ہوسکتے کہ اپنی مستورات کو علم کی نعمت سے محروم رکھتے ہیں۔ لڑکا ابتدا ابتدا میں عورتوں ہی سے پرورش اور تربیت پاتا ہے اور پھر ظاہر ہے کہ اگر ماں تربیت یافتہ ہو تو لڑکا بھی بچپن ہی کی حالت سے اپنی لائق اور پڑھی لکھی ماں کی تربیت یافتگی سے فیض پائے گا۔ اگر اوائل میں لڑکا کسی گنوارن کے سپرد ہوا تو بجز اس کے کہ گنواری بولنے میں طاق ہو جائے اور کچھ نہ سیکھے گا۔ ادب، تمیز، سلیقہ وہی عورت سکھا سکتی ہیں جو خود سلیقہ شعار اور باادب ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ذی لیاقت اور تربیت یافتہ میاں اور غیر تربیت یافتہ جاہل بیوی میں محبت کیوں کر ہوتی ہے... تربیت یافتہ بیوی میرے نزدیک میاں کے آرام و آسائش مزید کا باعث ہوتی ہے... اگر میاں بیوی دونوں پڑھے لکھے ہوں تو محبتِ باہمی کو ترقی حاصل ہو مگر اس ملک میں شیطان نے یہ پٹی پڑھا دی ہے کہ اِدھر عورت پڑھ لکھ سکی اور اُدھر اس نے نامحرموں کو عشقیہ خطوط لکھنے شروع کر دیے۔ حیف صد حیف کہ اس خیال خیام کے ڈرنے (جس کی ذرا بھی اصلیت نہیں) ہم لوگوں کے دلوں میں ایسی جگہ کر لی ہے کہ الاماں۔ الاماں[۲۳]۔

جلد اوّل، جلد دوم اور جلد سوم میں متعدد مقامات پر عورتوں کی تعلیم اور ان کے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک کے متعدد واقعات کا دل دوز بیان کیا ہے اور اکثر کسی کردار کی زبان سے اس رویّے کی مذمت کرائی ہے۔ چوتھی جلد کا آخری باب ''اختتام داستان'' بے حد اہم ہے کہ میاں آزاد ترکی، روس، پولینڈ کے معرکے سر کرنے کے بعد جنگ افغانستان میں فتح یاب ہونے کے بعد وطن واپس آتے ہیں تو حسن آرا بیگم نے مسجدوں میں گھی کے چراغ جلائے اور ناول کا اختتام بہت خوش آئند مستقبل کا اشاریہ ہے۔ آزاد نے اپنی پرانی روش یک سر بدل لی ہے اور اب انھوں نے خود کو قومی ترقی کے لیے وقف کر دیا ہے۔

فسانہ آزاد کے اس حصے کا ذکر شاذ کیا جاتا ہے۔ اس سے آزاد کے تصوّرِ کائنات اور بدلے ہوئے اسلوبِ زیست کا پتہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس دیکھیے:

''جب جنگ افغانستان سے آزاد پاشا واپس آئے تو حسن آرا بیگم نے مسجدوں میں گھی کے چراغ جلائے اور خوشی کے شادیانے بجائے... تین سال تک آزاد فرخ نہاد نے ہندوستان کی ترقی میں تہ دل سے کوشش کی۔ سررشتہ تعلیم کو نئے طرز پر قائم کیا۔ کورس کی کتابیں بدلیں۔ یونیورسٹی کے قواعد میں اُن کی تجویز سے بڑا تغیر و تبدل ہوا[۲۴]۔

اختتامِ داستان، ہمہ بین راوی(Omniscient Narrator) کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ ہر قسم کی معاشرتی پابندیوں سے گریزاں اور لذائذ حیات کے دلدادہ میاں آزاد، اب بالکل بدل گئے ہیں۔ قدیم تعصبات اور طرزِ حیات اب انھیں بے معنی نظر آنے لگا۔ آزاد، زندگی کرنے کی اب نئی حکمت عملی مرتب کرتے ہیں اور یہ محض فردِ واحد کی راہ نجات نہیں ہے بلکہ یہی راستہ قومی فلاح و بہبود کا ہے اور سرشار نے پوری داستان کو آخر میں اسی پہلو پر مرکوز کر دیا ہے۔ آزاد اب ایک عوامی دانشور کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ وہ ولایت سے شائع ہونے والے اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں اور انھوں نے تین سال، حسن آرا کے ساتھ خوش خوش زندگی بسر کی۔ لندن اور یورپ سے جب ہندوستان آئے تو انھوں نے کپڑے اور کاغذ کے کارخانے قائم کرنے کے حق میں رائے عامہ ہموار کی اور اخبارات میں مضامین لکھے۔ راوی بیان کرتا ہے:

> انھوں نے مختلف پیرائے اور پہلو سے ثابت کر دیا کہ جب تک کلوں کے ذریعہ سے صناعی کو ترقی نہیں دی جائے گی، ممکن نہیں کہ ہندوستان تہذیب و دولت اور سرسبزی اور مرفہ حالی میں یورپ کے کسی شائستہ ملک کا مقابلہ کر سکے۔ کیا مجال۔
>
> ان کی تحریروں اور فصاحت بیانی کا اس درجہ اثر ہوا کہ اکثر اولوالعزم بزرگوں نے اس طرف توجہ کی اور آزاد پاشا کی تجویز کے مطابق ڈنکن کمپنی کے مشہور کارخانے سے کاغذ کی مشین منگوائی۔ اس کے بعد آزاد نے حفظانِ صحت کی طرف توجہ کی اور ویکسینیشن بل یعنی ٹیکا لگانے کا مسودہ قانون ان کی جادو بیانی سے ایکٹ ہو گیا۔ جب ان کے دونوں صاحبزادے فضلِ خدا سے چودہ چودہ برس کے ہوئے تو دونوں کو لندن بھیجا تا کہ وہاں تعلیم پا کر دولتِ علم سے مالا مال ہو جائیں۔ یہ دونوں ہونہار لڑکے امتحان میں نہایت کامیابی کے ساتھ پاس ہوئے، ایک بیرسٹر اور سی۔ ایس، اور دوسرا صرف سی۔ ایس کا خطاب پا کر ولایت سے واپس آئے۔ حسن آرا نے اپنے گھر میں ایک مدرسہ تعلیمِ نسواں جاری کیا جس میں اکثر شریف زادیاں اور امیر زادیاں پڑھنے اور سینا سیکھنے کے لیے آتی تھیں[۲۵]۔

فسانہ آزاد کا مرکزی کردار "آزاد" انسانی کاملیت (Perfection) کا پیکر ہے اور ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی کا نقیب بھی ہے۔ اس کی ذات ہندوستانیوں کے لیے قابلِ اتباع ہے۔ اختتامی سطریں بہت بلیغ ہیں۔

> جب دونوں لڑکے دنیا میں بخوبی کامیاب اور مستفیض بہ مرام ہوئے اور آزاد اور حسن آرا نے اپنے دل کے ارمان نکال لیے تو اطمینان کمال کے ساتھ زندگی بسر کی اور دنیا کے جھگڑوں سے مطلق واسطہ اور تعلق نہ رکھا۔ آزاد پاشا کی کوئی تمنائے دل ایسی نہیں تھی جو بر نہ آئی ہو۔ علم و فضل میں یکتائے روزگار ہندوستان کے فخر افتخار، نثر میں منشی بے بدل، بلاغت نشاں، نظم میں شاعر لاثانی، سحر بیان، السنہ انگریزی و فرانسیسی میں طاق،

> عربی فارسی میں شہرۂ آفاق اس کے علاوہ اصول جنگ اور فنون سپہ گری میں برق تھے۔ پھر مدبر ایسے کہ کونسل واضعان آئین و قوانین میں نام کیا۔ اس کے علاوہ بیوی ملی تو حسن ظاہری اور جمال مبین کے علاوہ زیور حسن باطن سے بھی آراستہ اور اولاد خدا نے دی تو ہونہار بلند اقبال۔ الغرض آزاد نے لڑکپن سے بڑھاپے تک عیش و عشرت اور نیک نامی کے ساتھ زندگی بسر کی اور فرطِ ہمدردی سے ہم وطنوں کی ترقی میں ہمیشہ ساعی رہے۔[۲۶]

یہاں سرشار نے سیروانیتس(Miguel de Cervantes۔ ۱۵۴۷ء-۱۶۱۶ء) کے ناول ڈان کیہوٹے (*Dan Quixote*) کا ذکر نہیں کیا گو کہ انھوں نے اس ناول کے ایک حصہ کا ترجمہ خدائی فوجدار کے عنوان سے کیا تھا[۲۷]۔ اردو کے بیش تر ناقدوں نے سیروانیتس کے ناول سے فسانہ آزاد کی مماثلتوں کا ذکر کیا ہے مگر چارلس ڈکنس(Charles Dickens۔ ۱۸۱۲ء-۱۸۷۰ء) کے ناول (جس کا ذکر خود سرشار نے کیا ہے) کو فسانہ آزاد کے مطالعے میں اہمیت نہیں دی۔ فسانہ آزاد میں آزاد اور خوجی کے بیرونی اسفار روس اور ترکی کی جنگ میں شرکت اور پھر مستقل ایک دوسرے کے ہم رکاب رہنے سے ڈکنس کے ناول *The Pickwick Papers*(۱۸۳۷ء)، کے مرکزی کرداروں سیموئل پک وِک(Samuel Pickwick)اور ناداانئیل وینکل (Nathaniel Winkle) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ڈکنس نے بھی ناول کے ان دو مرکزی کرداروں کے حوالے سے لکھا ہے اور سرشار نے بھی آزاد اور خوجی کی وساطت سے قصہ در قصہ کی تکنیک پر استوار اپنا ناول لکھا ہے۔ وینکل شہ سوار اور جنگ جو ہونے کا مدلل دعویٰ کرتا ہے جو خوجی کے کردار سے مماثلت رکھتا ہے۔

ایک اور ناول *Pickwick Abroad* یا *The Tour in France* شائع ہوا اور اس کے خالق جارج ولیم میک آرتھر رینالڈس (George William Mac Aruther Reynolds۔ ۱۸۱۴ء-۱۸۷۹ء) تھے اور جن کے ایک ناول *The Mysteries of London* (۱۸۴۴ء) نے عدیم المثال مقبولیت حاصل کی تھی اور اس عہد میں رینالڈس کے ناول چارلس ڈکنس اور ولیم تھیکرے(William Makepeace Thackeray۔ ۱۸۱۱ء-۱۸۶۳ء) سے زیادہ مقبول تھے مگر اب رینالڈس کے ناولوں کا شاذ ہی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد، *The Pilgrim's Progress*، (Part one۱۶۷۸ء اور second part۱۶۸۴ء) اور *Gulliver's Travels* (۱۷۲۶ء)، میں ہیئت اور مواد کی سطح پر خاصی مماثلت نظر آتی ہے مگر سرشار نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے چار دیگر ناولوں کا ذکر کیا جس سے مغربی ادب سے ان کی واقفیت اور مطالعے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ عرض کیا جاچکا ہے کہ فسانہ آزاد اولاً قسط وار اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا اور اکثر قارئین ان سے ناول سے بابت استفسار بھی کرتے[۲۸]۔ ایک قاری نے میاں آزاد کے سفر ترکی کے ضمن میں لکھا کہ ناول سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سفر کے لیے درکار رقم کہاں سے

حاصل ہوئی۔ رتن ناتھ سرشار نے جواب میں لکھا۔ ”اوّل تو ناول کے ہیرو یا عورت سے یہ سوال کرنا کہ خرچ کہاں سے آیا، مناسب نہیں، پک وک[۲۹] کے ناول، والٹر[۳۰] کے ناول یا مانٹی کرسٹو[۳۱] جن کو انگریز جان سے عزیز رکھتے ہیں، سے یہ سوال نہیں پوچھا جاتا کہ خرچ کی سبیل کس طرح کی۔“

فسانہ آزاد کی آخری جلد سے علم ہوتا ہے کہ میاں آزاد کی کاوشوں سے ہر شہر میں میونسپل کارپوریشنیں قائم ہو جاتی ہیں اور مغربی ادویات کی دکانیں بھی کھل جاتی ہیں۔ میاں آزاد کی داستانِ دل پذیر کے اختتام سے سرشار کا یہ دعوی سچ ثابت ہوا کہ ہندوستانی، انگریزوں سے کسی طرح سے کم تر نہیں ہیں، بہ شرطے کہ انھیں مواقع فراہم کر دیے جائیں اور وہ اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کر لیں۔

سرشار کا ناول داستانوں کی روایت کی توسیع کے نئے امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس میں قصہ در قصہ تکنیک کی وساطت سے مختلف واقعات اور کہانیاں بیان کی گئی ہیں جو جغرافیائی حدود اور ثقافتی ضوابط اور ضابطۂ اخلاق کی سطح پر حیرت انگیز تنوع کا پتہ دیتی ہیں۔ بیانیہ کے مختلف نقطہ ہائے ارتکاز سے پلاٹ کا لچک دار ڈھانچہ، عالمِ وجود میں آتا ہے۔ مرکزی کرداروں: آزاد، خوجی، چھمی جان، ہمایوں فر، حسن آرا، سپہر، مائدہ، بھٹیاری، ثریا بیگم، نواب صاحب، میڈا، خانم، لطف علی، آسمان جان، وزیرن، جانی، مغلانی، حشمت، تجمل، روح، شاہ صاحب، ظریف، رامو، دنی، فقیرے، نورا، جنٹلمین، کلارسا، نازک ادا، گجراج سنگھ، آغا، مبارک محل، رونق ادا، شیدی، اور ٹھاکر صاحب، اور دیگر ثانوی کرداروں کے توسط سے انیسویں صدی کے نصف کے آخر کے تہذیبی، معاشرتی دانش ورانہ اور سیاسی سروکاروں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

فسانہ آزاد نے تمسخر، طنز، تضحیک، اور مزاح کے اسالیب آزمائے اور رجب علی بیگ سرور اور مرزار سوا کی نثر سے ایک مختلف محاورہ قائم کیا۔ اس محاورے کی اساس معاشرے میں مختلف سطحوں پر بولی جانے والی زبان پر قائم ہے۔ بولے گئے لفظ کے فوری پن اور برجستگی کو مکالمے کی صورت میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس نوع کی نثر کی ایک مثال دیکھیے:

> اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب نہ دیں تو بندے کی نظروں سے گر جائیں۔ مزہ جب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے، اِدھر اُدھر ڈھونڈتے اور آوازیں دیتے ہوں کہ بی شاب جان، صاحب، اے بی صاحب اور وہ بے خبری میں پیچھے سے ایک دھول جمائیں اور تنک کر کہیں: ارے مونڈی کاٹا، آنکھوں کا اندھا، نام نین سکھ، غل مچاتا پھرتا ہے۔ شاب جان، شاب جان، اے بی صاحب، تیری بی کو کیا کہوں، موئی کہیں چرخا کات رہی ہوگی اور ہم دھول کھا کر عمداً کہیں کہ دیکھیے سرکار! اب کی دھول لگائی تو خیر جواب دھول لگائی تو بگڑ جائے گی۔ بس کہہ دیا ہے اور وہ جھلا کر ایک اور جمائیں کہ ایں جناب کی ٹوپی گھوڑے پر جا کر گرے اور ہاتھ ہی اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تڑاپڑ دو چار اور جمادیں... تب ہنس کر کہوں: جانِ من! خدا گواہ ہے کہ اس وقت پیٹ بھرا ہے، ور

> نہ مارے بھوک کے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ سفر اور پردیس میں ایسی چاند تارہ، مہ پارہ کہاں ملتی ہے جو بے دھڑک ڈھول پر ڈھول جماتی اور ابھی کیا ہے، پیاری ذرا تہ دل ہو کے بیٹھیں تو پھر دو ایک جوتے ضرور لگانا، ہاں بے پاپوش کاری کے طبیعت بے چین رہتی ہے۔[۳۲]

فسانہ آزاد سے متعلق تحسینی کلمات اردو کے ہر ناقد نے ادا کیے ہیں۔ ان میں خورشید الاسلام کے مضمون "فسانہ آزاد" کو برصغیر کے ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ دس صفحات پر مشتمل یہ مضمون فسانہ آزاد کے مکمل متن سے اعراض برتنے کی روش کا غماز ہے۔ خورشید الاسلام کا خیال ہے۔

> آزاد پرانی تہذیب سے بغاوت کرتے ہیں، لیکن نئی تہذیب کا لباس ان کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا معلوم ہوتا ہے۔ وہ پرانی قدروں اور اداروں پر طنز کرتے ہیں، لیکن ان میں نئی قدروں اور نئے اداروں کے جنم دینے کی صلاحیت کی کمی ہے۔[۳۳]

اس کے علی الرغم فسانہ آزاد کی آخری جلد سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد (مصنف نہیں بلکہ ناول کا کردار میاں آزاد) نے نئی اقدار کو قبول کیا اور نئے اداروں کو جنم دیا ہے۔ مثلاً انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، کاغذ اور کپڑے کے کارخانے قائم کیے، معالجہ کا نظم کیا۔ ان کی بیوی نے مدرسہ تعلیمِ نسواں قائم کیا اور کلونیل دورِ حکومت میں ایک نیا اسلوبِ زیست وضع کیا۔ فسانہ آزاد کے دو مرکزی کرداروں آزاد اور خوجی کے بارے میں خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

> آزاد نئی حقیقت کا ترجمان ہے۔ ماضی اپنے حدود میں واضح ہے، وہ ظرافت کا نشانہ ہے، نئی حقیقت ابھی ایسے نئے امکانات کی تلاش میں ہے اور اسی سے پوری طرح واضح نہیں ہو پاتی۔ خوجی کی سیرت اپنے اخلاقی اور ذہنی محرکات اور سماجی عوامل کے ساتھ نئے زمانے سے متصادم ہو کر فنی خوبیوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن آزاد ابھی تک شک میں گرفتار ہے، وہ متوازن نہیں ہے، وہ ایک نصب العین کو ماننے کے باوجود اپنے ماحول کے بار سے دبا ہوا ہے۔ خوجی ایک مردہ حقیقت ہے اور ایک زندہ کردار ہے جس کے اندرون میں ایک وعدہ چھپا ہوا ہے۔ وہ خوجی کی طرح تراشا نہیں جا سکتا تھا اس میں جمالیاتی حدت نہیں ہے کیوں کہ اس کی شہرت میں اس دور کے شک و شبہ کو دخل ہے۔[۳۴]

احتشام حسین کے مضمون "خوجی ایک مطالعہ" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور غالباً اردو میں کسی ایک کردار کا مرکوز پہلا تفصیلی مطالعہ تھا۔ مضمون میں کلیم، نصوح اور ابن الوقت کے ساتھ آزاد اور خوجی کے کردار کو ایک خاص نوع کی ابدیت کا حامل ٹھہرایا گیا ہے۔ چار ہزار صفحات سے زائد ضخامت کو محیط فسانہ آزاد ایک مخصوص عہد کی معاشرت کے ہمہ گیر اور پیچیدہ اثرات کو فاعلی طور پر برتنے والے تجربے کے پہلودار اظہار سے عبارت ہے۔ اس میں کرداروں کی نفسیاتی گرہوں اور ان کے

وجودی سروکاروں کو گہری انسانی بصیرت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے محض وقوع پذیر ہونے والی حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے بلکہ مستقبل کے امکان کا انسانی تناظر میاں آزاد کی وساطت سے آخر میں بیان کیا اور یہی فسانہ آزاد کا امتیازی عنصر ہے مگر احتشام حسین نے پوری کہانی کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> چار ہزار صفحوں کی اس داستان کا خلاصہ چند سطروں میں بیان ہو سکتا ہے، اگرچہ افسانہ کا عمل لکھنؤ، بمبئی، اسکندریہ، مالٹا، ترکی وغیرہ سب جگہ ہوتا ہے۔ سچ پوچھیے تو قصہ صرف اتنا ہے کہ میاں آزاد ایک بہادر، خوب صورت، عالم اور عاشق مزاج شخص ہیں۔ لکھنؤ سے ایک نواب زادی کی محبت کے سلسلے میں روم جا کر مذہبی لڑائی میں شریک ہوتے ہیں، وہاں سے کامیاب ہو کر اپنی مراد کو پہنچتے ہیں۔ بس یہ ہے اصل کہانی۔ ویسے افسانہ در افسانہ میں غیر ضروری تفصیلات سے تو ہر قدم سابقہ پڑتا ہے۔[۳۵]

احتشام حسین نے خوجی کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ان کا یہ نکتہ اہم ہے کہ خوجی اور آزاد دونوں مل کر ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔ علیٰحدہ علیٰحدہ ان میں سے کوئی بھی مکمل نہیں۔ خوجی کی سیرت آزاد کی صحبت میں نمایاں ہو سکتی تھی۔ وہ آزاد ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ آزاد کو اگر بگاڑ دیا جائے تو وہ خوجی بن جائے گا اور خوجی کو سنوار دیا جائے تو وہ آزاد کے قریب پہنچ جائے گا۔

سرشار اور علی الخصوص خوجی سے متعلق سب سے خیال انگیز اور تنقیدی ژرف نگاہی (Critical Acuity) سے مملو مضمون کسی سکہ بند نقاد نے نہیں، بلکہ فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء) نے لکھا جو دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ آج کل (اکتوبر ۱۹۴۵ء) میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے میزان میں بھی شامل ہے۔ فیض کا خیال ہے کہ سرشار نے لکھنؤ کے لاابالی امرا اور ان کے گرد گھومنے والی لاتعداد مخلوق کی مرقع کشی کی ہے۔ نواب، امرا، شہوار، بھٹیارنیں، بھانڈ، جور، گھٹہ کترے، علما، صوفی، افیمچی، قمار باز، ارباب نشاط سب ایک ہمہ گیر بے مقصد دھکا پیل میں منہمک ہیں۔ فیض آگے لکھتے ہیں:

> سرشار نے جو تصویر بنائی ہے وہ کچھ حقیقی ہے، کچھ خیالی، لیکن ان دونوں پہلوؤں میں فرق کرنا مشکل ہے۔ آپ نے انگریزی اخباروں میں مشہور اور معروف چہروں کی بگڑی ہوئی مضحکہ خیز تصاویر دیکھی ہوں گی، جنھیں کیری کیچر کہتے ہیں۔ نقاش، چہرے کے اصلی خد و خال میں کچھ ایسی افراط و تفریط کرتا ہے کہ چہرے کی ہیئت بہت کچھ مسخ ہونے کے باوجود بھی وہی رہتی ہے۔ کچھ اس نوع کی افراط و تفریط، سرشار نے اپنی تصویر میں کی ہے۔ فسانہ آزاد کے تمام کرداروں اور ان کرداروں کی تمام سرگرمیاں محسوس اور موجود ہونے کے باوجود ظنی و غیر حقیقی اور غیر واقعی معلوم ہوتی ہیں۔[۳۶]

یقیناً یہ نکتہ خیال انگیز ہے کہ حقیقت کی عکاسی اس طرح کی جائے کہ محسوس تجربے یا واقعات میں مضمر التباس (Illusion) کے نقوش بھی واضح کیے جائیں۔ معاملہ یوں ہے کہ سرشار نے انیسویں صدی کے معاشرے کو ثنویت پر استوار ایک

متحرک کڑی کے طور پر پیش کیا ہے۔ روحِ عصر کا ترجمان، آزاد ہے اور قدیم تہذیب کا نمائندہ، خوجی ہے، یہ دونوں حقیقت نہیں بلکہ حقیقت کا التباس پیش کرتے ہیں۔ خوجی کو عموماً لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں فیض نے لکھا:

> سرشار کے طنز کا سب سے بڑا مظہر خوجی کا کردار ہے۔ بزدل بھگوڑا لیکن شیخی خور اور لاف زن، بدصورت اور بے ڈول لیکن بزعم خود یوسف ثانی، خوشامد پسند لالچی لیکن بقول خود خوددار اور فقیر صفت، ہوس پرست لیکن ہوس پرستی کے ثمرات سے ناآشنا۔ یہ مضحکہ خیز شخصیت تنزل پر ہر درباری طبقے کی آخری منزل ہے۔[۳۷]

خوجی کے کردار کی تفہیم کا بنیادی رمز یہ ہے کہ جب انسان ہر میدان کا مرد میدان بنے یعنی کاملیت (Perfection) حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا ہر عمل مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ کاملیت کا حصول انسان کی ازلی خواہش ہے جو پایانِ کار مضحکہ خیزی پر منتج ہوتی ہے۔ یہ بنیادی انسانی جذبہ ہے اور اس کا کوئی تعلق کسی مخصوص خطۂ ارض یا تہذیب سے نہیں ہے۔ اس سلسلے میں فیض نے کیا پتے کی بات لکھی ہے:

> سرشار نے خوجی کی تخلیق سے یہ دکھانا چاہا کہ اگر ساری صفات ایک انسان میں اکٹھی کر دی جائیں تو اس کی کیا صورت بنتی ہے۔[۳۸]

یہ صورت مضحکہ خیزی کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی ہے اور خوجی کا کردار اس اجمال کی تفصیل ہے اور اس کا لازمی تعلق لکھنؤ سے نہیں ہے۔

فسانہ آزاد میں ہر چند کہ فارسی کے اشعار بکثرت استعمال کیے گئے ہیں اور عربی اور فارسی کے ادق الفاظ بھی کثرت سے نظر آتے ہیں مگر سرشار نے رسمی پیرایۂ بیان کی اساس صوتی تاثر پر رکھی ہے۔ انھوں نے صوت و صدا کے سماعی تجربے کو بصری اور کثیر حسی پیکروں میں منقلب کیا ہے اور آواز کو صورتِ حال کی تجسیم کے لیے فن کارانہ مہارت سے استعمال کیا ہے۔ فسانہ آزاد میں ایک جگہ پیڑ گرنے کا ذکر ہے اور یہ دو سطریں، پیڑ گرنے کی آواز کو مجسم کرتی ہیں۔ فسانہ آزاد اس نوع کی متعدد مثالوں سے آباد ہے۔ معشوق اور عاشق کی نازک نفسی کیفیات اور افعال کی کثرت، اضطراب اور ہیجان کے داعیوں کو متحرک کرتی ہے۔

> جب سوار تجربہ کار نے یہ کیفیت معشوق و حالت عاشق زار کی دیکھی تو تالاب سے اپنی لمبی ٹوپی میں پانی بھر لایا اور وینشیا کے سر پر آبِ سرد ٹپکایا۔ پھر دو تین بار گیا اور اسی طرح پانی لایا۔ اس کے بعد باغ کے دو تین درختوں کی پتیوں کو بوباس میں عطر و گلاب سے گوئے سبقت لے گئی تھیں، توڑا اور خوب زور سے ہتھیلی پر نچوڑا۔ اسی کا لخلخہ بنایا اور اس نوش لب کو سونگھایا۔ تو تھوڑی سی دیر میں ہوش آیا۔ آنکھیں کھولتے ہی تین بار اپنے محبوب

رعنا کا نام لیا۔[۳۹]

آزاد، لکھنؤ کی طرزِ بود و باش، انواع و اقسام کے پکوانوں اور تفریحی مشاغل کی وضاحتی فہرست پیش نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ طعام پسند معاشرے میں انواع و اقسام کے کھانوں کی مقبولیت کے ذکر تک بھی خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ لکھنؤ، بمبئی، روس، ترکی اور دیگر مقام پر رہنے والے افراد کو ان کی تمام تر خوبیوں اور کم زوریوں کے ساتھ ایک محسوس تجربے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اودھ اخبار[۴۰] سے اطلاع ملتی ہے کہ اودھ اخبار میں ان کی تازہ تصنیف فسانہ جدید کے عنوان سے قسط وار شائع ہونے لگی تھی اور یہ کتاب ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔ اودھ اخبار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منشی نول کشور کی ایما پر پنڈت مادھو پرساد کے ساتھ مل کر سرشار نے اس پر نظر ثانی کی اور اس کتاب کو جام سرشار کے عنوان سے شائع کیا۔ پنڈت مادھو پرساد ممالک مغربی و شمالی (اودھ) میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے اور انھوں نے ۷۸۴ صفحات پر مشتمل اس ناول پر نہ صرف نظر ثانی کی بلکہ تقریظ بھی لکھی جو ۱۸۸۷ء کے ایڈیشن میں شامل ہے مگر دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے[۴۱]۔ اس ناول کی ابتدا ذیلی عنوان ''تمہید'' سے ہوتی ہے جس میں شراب نوشی کے مضر اثرات مضمون کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ مضمون نما ساخت اصلاحی ناولوں کا خاص وصف ہے اور سرشار نے بھی اس کا لحاظ رکھا ہے۔

فسانہ آزاد کی طرح جام سرشار میں بھی اصلاح اور ظرافت کے پہلو نمایاں ہیں۔ سرشار نے اودھ اخبار میں لکھا کہ اس ناول کا مقصد شراب نوشی کے خطرات سے قارئین کو آگاہ کرنا ہے۔

> اٹھائی گیرا، لقّا، دغاباز، جعل ساز، گرہ کٹ، چور اچکا، ڈاکو، بدمعاش، اوباش، یہ سب برے مگر شرابی ان سب کا گرو گھنٹال ہے۔ کوئی شخص چاہے جعل بنانے میں میاں بخش کے بھی کان کاٹے مگر شرابی سے اس کو اچھا ہی سمجھیں گے۔ حالانکہ حسین بخش نے ماشاء اللہ وہ نیک نامی حاصل کی ہے کہ اچھے اچھے جعلیے اس کا نام سن کر اپنا کان پکڑتے ہیں۔ ڈکیتی میں کوئی آکر ظلم بپا کرے ہمارے نزدیک شرابی سے وہ پھر بھی اچھا ہے۔ بدمعاش کیسا ہی پرلے سرے کا کیوں نہ ہو، شرابی پر اس کو فضیلت حاصل ہے قس علی ھذا۔ اچکوں پر بھی شرابی کو ترجیح ہے۔ شرابی یہاں ہم پر ان حضرات سے مراد لیتے ہیں جو شراب کے بندے ہیں۔ اور بادہ گساری کو دین ایمان سمجھتے ہیں۔ دن رات غین، ہر دم بدمست، بادہ پرست، جب دیکھیے مخمور نشے میں چور، یہ گرے وہ گرے۔[۴۲]

جام سرشار کی کہانی، مرکزی کردار نواب امیر الدین حیدر کی نشیب و فراز سے پُر حیات کی روداد، رومانی طرزِ اظہار سے بڑی حد تک اجتناب کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مرصع اور رنگین نثر کے نمونے کم ہیں۔ ظہورن کے قتل اور نواب صاحب کے گاڑی بان پر ایک قلی کو زد و کوب کرنے کے الزام میں مقدمہ چلتا ہے۔ سرشار نے مقدمے کی جاں کاہ تفصیل بیان کرکے برطانیہ

کے تعزیری نظام پر سوالیہ نشان قائم کیے ہیں اور نو آبادیات کے خلاف ایک نوع کی مزاحمت کا ثبوت دیا ہے۔ مصنف نے یہ باور کرایا ہے کہ برطانوی نظامِ حکومت اور قانون اور ضوابط، ہندوستان کے موافق نہیں ہیں اور یہ قوانین اصلاً عوام دشمن ہیں۔ فسانہ آزاد کے برخلاف جام سرشار کا پلاٹ بہت مربوط اور بجا طور پر جدید اردو ناول کا پیش رو ٹھہرتا ہے۔

سرشار کا دو جلدوں پر مبنی تیسرا ناول سیر کہسار ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا۔ یہ لکھنؤ کے ایک عاشق مزاج نواب عسکری کی داستاں ہے جو انگریز افسروں کی تقلید میں موسم سرما میں نینی تال کا رخ کرتے ہیں۔ ایک انگریز فریزر ان کا پڑوسی ہے اور یہیں نواب کی آنکھیں ایک دوشیزہ قمرن سے لڑ جاتی ہیں۔ مختلف واقعات اور انگریز افسر سے ان کے تعلق کی تفصیل سے ناول کے صفحات آباد ہیں۔

کامنی ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ایک تعلیم یافتہ دوشیزہ "کامنی" کی رودادِ حیات ہے۔ کامنی، رنبیر سنگھ کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور اس کی شادی بھی رنبیر سنگھ کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ رنبیر سنگھ خاندانی روایات کے مطابق فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے اور ایک جنگ میں وہ مارا جاتا ہے۔ کامنی بہت کم عمر میں بیوہ ہو جاتی ہے اور عورتوں اور بچوں کے فلاحی کاموں میں خود کو منہمک کر دیتی ہے مگر شوہر کی یاد اس کے دل سے محو نہیں ہوتی۔ بعد ازاں پتہ چلتا ہے کہ رنبیر مرا نہیں ہے بلکہ لیڈ میں ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہ واپس آ جاتا ہے۔ ہندو معاشرت کے پہلو دار بیان کو محیط یہ سرشار کا پہلا ناول ہے اور یہاں بھی سرشار نے مشترکہ تہذیب کے نقوش اجاگر کیے ہیں۔ داستان کی روایت یعنی قصہ در قصہ کی پاس داری کی گئی ہے۔ یہ ناول بیوہ کی دوبارہ شادی کے مسئلہ کو بھی موضوع بحث بناتا ہے۔

کڑم دھم، پجاری، دلہن، طوفان بے تمیزی، بی کہاں اور ھشو سرشار کے مختصر ناول ہیں۔ مختصر ناول طوفان بے تمیزی فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم منافرت کے جذباتی اثرات کو خاطر نشان کرتا ہے۔ سرشار کے نزدیک فرقہ واریت ایک غیر انسانی سرگرمی ہے۔

سرشار کے تراجم میں ان کی پہلی کتاب شمس الضحی شامل ہے۔ سرشار کے سوانح نگاروں اور آل احمد سرور نے اسے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ قرار دیا ہے۔ سرور صاحب[۴۳] نے لکھا کہ علم ہیئت کی ایک کتاب کا سرشار نے سلیس اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ صوبے کے ڈائریکٹر تعلیمات سرشار کے ترجمے کے بڑے مداح تھے اور ان کی سفارش سے سرشار کو ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کی ادارت مل گئی۔ اس سلسلے میں دل چسپ بات یہ ہے کہ شمس الضحی کے سرورق پر درج ہے کہ یہ انگریزی کی کسی ایک کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ یہ ابر، ہوا، سورج اور دیگر مظاہر فطرت پر مختلف انگریزی مضامین سے ماخوذ مواد کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔

خدائی فوجدار کے، جو ڈان کیہوٹے کا آزاد ترجمہ ہے، پیش لفظ میں سرشار نے لکھا ہے کہ انھوں نے ہنٹر کے ایک سیاسی پمفلٹ، مصر کی تاریخ پر ایک کتاب شاخِ بنات کا اردو میں ترجمہ کیا تھا[۴۴]۔ یہ تراجم دستیاب نہیں ہیں۔ فیروز حسن، جنھوں نے تحقیقی کاوش کے ساتھ سرشار کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے، نے بھی لکھا ہے کہ یہ کتابیں انھیں بھی حاصل نہیں ہو سکیں[۴۵]۔

سرشار کے ترجمے کی چار کتابیں اعمال نامہ روس (۱۸۸۷ء)، مکتوبات ڈفرن (۱۸۸۸ء)، خدائی فوجدار (۱۸۹۴ء) اور الف لیلہ (۱۹۰۱ء) ہیں۔ سرشار کے تراجم کے سلسلے میں دل چسپ بات یہ ہے کہ لارڈ ڈفرن (۱۸۲۶ء-۱۹۰۱ء) نے ۱۸۸۴ء میں ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور اعمال نامہ روس کے مصنف ڈی میکنزی ویلس (D. Mackenize Wallace۔ ۱۸۲۶ء-۱۹۰۲ء) ان کے پرائیوٹ سیکریٹری تھے[۴۶]۔ سرشار نے ڈفرن کی کتاب *Letters From High Latitudes* کا ترجمہ کیا، یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ اصلاً ڈفرن کا سفر نامہ ہے جب انھوں نے ناروے کے دو جزیروں Jan Mayen اور Spitzbergen کا سفر کیا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس سال تھی۔ ڈفرن نے سفر سے متعلق تاثرات، اپنی ماں کو خطوط میں لکھے تھے اس کو مزاحیہ ''سفر نامہ'' کی سب سے بہتر مثال قرار دیا جاتا ہے۔

سرشار نے وائسرائے اور ان کے سیکریٹری کی کتابوں کو ترجمے کے لیے کیوں منتخب کیا؟ اس ضمن میں فیروز حسین نے لکھا ہے، اودھ اخبار کے مالک منشی نول کشور ان تراجم کی وساطت سے، لارڈ ڈفرن کی خوشنودی کے خواہاں تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ملازم پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سپرد یہ کام کیا۔ فیروز حسن نے یہ بھی لکھا کہ روس کی تاریخ سے اردو کے قارئین کو کیا دل چسپی ہو سکتی تھی۔ وائسرائے سے قربت حاصل کرنے کی بات تو شاید درست ہو مگر روس سے متعلق ان کی بات صحیح نہیں ہے۔ اس زمانے میں روس اور ترکی کی جنگ جاری تھی، لہٰذا اردو قارئین روس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اطلاعات کے خواہاں تھے۔ ویلس کی کتاب کا نام روس ہے۔ سرشار نے ترجمے میں ''اعمال نامہ'' کا اضافہ کر کے اسے اخلاقی نقطۂ نظر سے گراں بار کر دیا ہے۔ انھوں نے ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۵ء روس کا سفر کیا۔ یہ سفر نامہ دو جلدوں میں ہے اور ۶۲۸ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔ منشی نول کشور نے اعمال نامہ کے مقدمہ میں لکھا:

> جب میں نے اس کتاب کے ترجمے کا ارادہ کیا، تو ابتدا میں تذبذب کا شکار تھا کہ اس نہایت اہم کام کے لیے کون شخص موزوں ترین ہو گا۔ بالآخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ ذمّہ داری پنڈت رتن ناتھ سرشار کو سونپی جائے، جو اودھ اخبار سے وابستہ تھے۔ خوشی ہے کہ اہلِ نظر نے ان کے ترجمے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔[۴۷]

ترجمے کا محاسبہ کرنے والے کون حضرات تھے، اس کی وضاحت نہیں ہے۔ منشی نول کشور اپنے مطبع سے شائع ہونے والی

کتابوں پر مقدمہ یا تعارف شاذ ہی لکھتے تھے۔ وائسرائے کے سیکریٹری کی کتاب کے ترجمے کو یہ شرف ضرور حاصل ہوا۔ سرشار کے تراجم پر عبدالرشید صدیقی کی کتاب پنڈت رتن ناتھ سرشار کے تراجم ایک تنقیدی جائزہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل مقالہ ہے جس پر مصنف کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ایم فل کی ڈگری تفویض کی تھی۔ ترجمے کو تصنیف کے مدِ مقابل یا اس پر ترجمے کا گمان نہ گزرنے کو اردو داں حلقوں میں سب سے اہم خوبی متصوّر کیا جاتا ہے حالاں کہ یہ تصوّر محض خیام خالی پر مبنی ہے۔ ترجمہ، بہر صورت ترجمہ لگنا چاہیے اور ترجمے کی خوبی، محض روانی پر منحصر نہیں ہوتی۔ عبدالرشید نے اعمال نامہ روس کے سلسلہ میں لکھا:

> سرشار نے اس ترجمے کو خشک نہیں ہونے دیا۔ اگر کتاب سے یعنی ترجمہ تاریخ روسیہ اور میکنیزی کا نام ہٹا دیا جائے تو یہ سرشار کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ غرض سرشار نے ترجمہ کو تصنیف کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا ہے اور یہی ایک بہترین ترجمہ کی پہچان ہے۔[۴۸]

فیروز حسین نے سرشار کے تراجم کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور انگریزی متن اور اردو ترجمہ کے تقابلی مطالعہ سے نتائج کا استخراج کیا ہے۔ مصنف کے انگریزی مقالے کا دسواں باب سرشار کے تراجم کے مطالعے پر مبنی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرشار کی انگریزی کی استعداد واجبی سی تھی اور وہ انگریزی محاورے سے واقف نہیں تھے۔ روس سے متعلق سفر نامے میں جن موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے متعلق اردو ذخیرۂ الفاظ بھی بہت محدود ہے۔ فیروز حسین نے اس سلسلے میں متعدد اقتباسات درج کیے ہیں جن میں ترجمہ کی فاش غلطیاں نظر آتی ہیں، اس کی محض ایک مثال دیکھیے۔ ویلس نے ماسکو کے ایک شخص کے بارے میں لکھا:

"He Looked like a bull in a China shop"۔[۴۹]

سرشار نے اس کا ترجمہ کیا "ماسکو میں اس کا درجہ وہی تھا جو چین کے بازاروں میں سانڈ کا درجہ ہے، گویا وہ پوجا جاتا تھا۔"

سرشار انگریزی میں محاورہ A bull in a China shop سے واقف نہیں تھے، اس کا اردو ترجمہ بے قابو ہونا ہوتا ہے۔ سرشار کو گمان گزرا کہ چین میں بھی سانڈ کو ہندوستان کی طرح کا تقدس حاصل ہے۔

لارڈ ڈفرن کی کتاب کا ترجمہ مکتوبات ڈفرن کے عنوان سے ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا، اور فیروز حسین نے اس کا نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں دیکھا۔ سرورق پر اردو ترجمہ لکھا ہے مگر ترجمے کا متن فارسی میں ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ فارسی میں کیوں شائع کیا گیا، یہ سوال ہنوز تشنہ تحقیق ہے۔ ڈان کیہوٹے کا آزاد ترجمہ سرشار نے ۱۸۹۴ء میں کیا اور یہ اصل کتاب کی تلخیص ہے۔ کتاب کے سلسلے میں سرشار نے لکھا:

> ڈان کوئکساٹ [ڈان کیہوٹے] جو ہماری کتاب کے ہیرو ہیں، ان کا نام ہم نے اس ترجمہ میں خدائی فوجدار رکھا ہے اور یہ نام ان کی شان کے از بس شایان ہے اور نہایت ہی موزوں۔ خدائی فوجدار یا خدائی خوار یہی نام

> ان کے لیے زیبا ہے۔ واضح ہو کہ ہمارے ہیرو ایک پڑھے لکھے تربیت یافتہ آدمی، دال روٹی سے خوش، ایک قصبے میں رہتے تھے مگر اس قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا جن میں پوچ یاد ہو، مہمل داستان ہائے رزم کا ذکر ہو۔ سو باتوں میں سو کی سو لغو۔ ایک بھی صحیح نہیں۔ مثلاً ایک آدمی اس قدر جری تھا کہ اس نے دیو کی پلٹن سے مقابلہ کیا اور پلٹن کی پلٹن کو ضربِ شمشیر سے خاراشگاف سے جہنم واصل کیا۔ یا یہ ایک کم سن پر ایک خبیث عاشق ہوا اور اس کو دق کرنے لگا اس نے ایک نامی گرامی پہلوان سے مدد مانگی اور پہلوان نے اس خبیث کو ایک بوتل میں، جس میں قیامت کا پانی کھولا کرتا تھا، بند کر کے کیفر کردار کو پہونچایا تھا۔[۵۰]

ڈان کیہوٹے کے کرداروں سے خدائی فوجدار کی نسبت بڑی واجبی ہے۔ وہ نرالا شیخی باز، لاف گز، اوباش، بدمعاش اور بے وقوف ہے۔ اسی طرح بدھو کا کردار بھی اصل ناول کے کردار سانچو سے بہت کم مماثلت رکھتا ہے۔ سرشار نے اصل کو ہندوستانی قالب میں ڈھال لیا اور نام اور واقعات بھی تبدیل کر دیے ہیں اور یورپی کھانوں کی جگہ، ہندوستانی پکوانوں کا ذکر کیا ہے۔

سرشار نے الف لیلہ و لیلہ کا بھی ترجمہ کیا جو ۱۰۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۰۱ء میں نول کشور پریس سے شائع ہوا۔ سرشار نے لکھا کہ انھوں نے مختلف زبانوں میں لکھی گئی الف لیلہ کو پیشِ نظر رکھا ہے مگر مسعود حسین رضوی کے مطابق سرشار نے رجب علی بیگ کی کتاب شبستان سرور جس میں الف لیلہ کی بعض داستانوں کی باز خوانی کی ہے، کا ترجمہ کیا ہے۔[۵۱]

شمس الضحی کو سرشار کی اوّلین تصنیف سمجھا جاتا ہے مگر ۱۹۶۷ء میں مسرت حسین آزاد اور عابد رضا بیدار نے سرشار کی ایک تفصیلی تقریظ شائع کی ہے جو نواب رامپور کے سفر نامہ حج قندیل حرم میں شامل ہے یہ سفر نامہ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔ سرشار کی تقریظ علیحدہ طور پر انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رام پور نے شائع کی ہے۔

سرشار کی صحافتی تحریروں علی الخصوص اودھ اخبار میں شائع ہونے والے ان کے اداریوں کو مطالعہ کا مرکز کم ہی بنایا جاتا ہے۔ سرشار نے ۸ اگست ۱۸۷۸ء کے اخبار میں مدیر کے فرائض پر روشنی ڈالی۔ سرشار نے شراب نوشی، بیوہ کی شادی، ہندوستانی زبانوں کے رسم الخط کے استعمال، اراضی مالکوں کے مسائل، لکھنؤ میں باغوں کی کمی، مویشیوں کی بیماریوں، اور ورزش کے فوائد، ہندوستانی موسیقی، توہمات، بھکاریوں کی کثرت، فرقہ وارانہ فسادات، ہندو مسلم منافرت اور ادب میں فحاشی کے مسائل پر تواتر کے ساتھ اظہار خیال کیا۔

سرشار کی ادبی، علمی اور صحافتی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے۔ ان کی تحریر داستان اور ناول کے آمیزے سے نمو پذیر ہوتی ہے اور انیسویں صدی کے نصف آخر کے لکھنؤ کا ایک حسّی رویا خلق کرتی ہے مگر انھوں نے انسان کے ازلی اعتبارات (Ultimate Concerns) کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔

ان کے شہرہ آفاق کردار خوجی اور ڈان کیہوٹے کے اردو ترجمے کے کردار خدائی فوجدار اپنے ہر فعل سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کاملیت کے حصول کی کوششیں مضحکہ خیزی کی نت نئی صورتوں کو سامنے لاتی ہیں۔ سرشار غالباً اردو کے پہلے ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے ایک حقیقی شہر کو ایک تخیلی شہر کے طور پر منقلب کرکے اس کے مختلف اور متضاد امکانات وا کیے، اور تب حسِ ظرافت انسان کی بقا کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ:۱۹۶۶ء) پروفیسر، شعبۂ ترسیل عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا۔ shafeykidwai@gmail.com

۱۔ تبسم کاشمیری، فسانہ آزاد: ایک تنقیدی جائزہ (اردو رائٹرز گلڈ، ۱۹۸۰ء)، ۷۔

۲۔ لطیف حسین ادیب، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری (انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء)۔

۳۔ پریم پال اشک، پنڈت رتن ناتھ سرشار: حیات، شخصیت اور کارنامے (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۱۹۸۲ء)۔

۴۔ بشن نرائن در [Bishan Narayan Dar]، "Ratan Nath: A Study"، مشمولہ *Hindustani Review*، مدیر Mr. S. Sinha (۱۹۰۴ء)۔

۵۔ قمر رئیس، رتن ناتھ سرشار (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۳ء)، ۸۲۔

۶۔ مرزا جعفر حسین (۱۸۹۹ء-۱۹۸۸ء): ممتاز ادیب اور لکھنوی معاشرت اور تہذیب کے مستند شارح۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ لکھنو سے متعلق ان کی تین کتابیں بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں (۱۹۷۸ء)، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار (۱۹۸۰ء)، لکھنؤ کا قدیم دستر خوان (۱۹۹۰ء)، بر صغیر میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی دیگر اہم تصانیف کشمکش حیات (آپ بیتی ۱۹۸۴ء)، ادبیات اور شخصیات (۱۹۷۸ء)، متاع غالب (انتخاب غزلیات فارسی، ۱۹۶۹ء) اور مسعود حسین رضوی: ادیب، حیات اور خدمات (۱۹۷۷ء) ہیں۔

۷۔ قمر رئیس، رتن ناتھ سرشار، ۸۔

۸۔ عبدالرشید صدیقی، پنڈت رتن ناتھ سرشار کے تراجم (علی گڑھ: صبا پرنٹنگ ورکس، ۱۹۹۷ء)۔

۹۔ برج نرائن چکبست، "پنڈت رتن ناتھ در سر شار (مضمون)، کشمیر درپن، مئی ۱۹۰۴ء"، مشمولہ مضامین چکبست (الہ آباد: انڈین پریس لمیٹڈ، ۱۹۳۷ء)، ۳۲-۳۴۔

۱۰۔ دیکھیے: https://www.lucknow.nic.in/nawabs of lucknow

۱۱۔ پریم پال اشک، پنڈت رتن ناتھ سرشار: حیات، شخصیت اور کارنامے، ۱۰۔

۱۲. قمر رئیس، رتن ناتھ سرشار، ۲۴۔

۱۳۔ سر جان لارنس: ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۹ء تک وائسرائے اور گورنر جنرل آف انڈیا رہے۔ ان ہی کے عہد میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس ہائی کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔

۱۴۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد جلد اول، چھٹا ایڈیشن، (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۰۷ء)۔

رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد جلد دوم، چوتھا ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۱۶ء)۔

رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد جلد سوم، پانچواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۰۸ء)۔

رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد جلد چہارم، پانچواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۱۵ء)۔

بحوالہ: فیروز حسین، "Life and works of Rattan Nath Sarshar"، غیر مطبوعہ مقالہ برائے حصولِ ڈگری، پی ایچ۔ڈی، (یونیورسٹی آف لندن، سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز، جولائی ۱۹۶۴ء)۔

۱۵۔ مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۱۶۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول، آٹھواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۲۳ء)، ۱-۲۔

۱۷۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول، آٹھواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۲۳ء)۔

۱۸۔ اودھ اخبار ۲۳/ دسمبر ۱۸۷۸ء۔

۱۹۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول، آٹھواں ایڈیشن، ۱۵۔

۲۰۔ عام طور پر ۱۸۲۲ء ہی کو کلکتہ میں اردو اخبارات کے اجرا کا سال کہا جاتا ہے، مگر عتیق احمد صدیقی کے بقول ۱۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو اخبار کی اشاعت کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اخبار کا اجرا چند ماہ بعد ہوا۔
سمیع احمد، اردو صحافت اور تحریکِ آزادی، (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹)، ۴۷-۵۰۔

۲۱۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول، آٹھواں ایڈیشن، ۹۲۔

۲۲۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول، آٹھواں ایڈیشن۔

۲۳۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد چہارم، آٹھواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۲۶ء)، ۳۷۴-۳۷۵۔

۲۴۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد چہارم، آٹھواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۲۶ء)، ۱۰۷۰

۲۵۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد چہارم، آٹھواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۲۶ء)، ۳۷۴، ۱۰۷۰۔

۲۶۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد چہارم، آٹھواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۲۶ء)، ۱۰۷۱-۱۰۷۲۔

۲۷۔ *Don Quixote* (two Parts 1605 and 1615) and the full name is *The Ingenious Gentleman Don Quixote of La Mancha* کا دوسرا اڈیشن ۱۹۰۳ میں منشی نول کشور سے چھپا، سرورق پر لکھا ہے "خدائی فوجدار ترجمہ کتاب ڈان کوئیگٹ ڈی لا منشا" (جلد اول اور دوم) جو پہلے اسپین کی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی، انگریزی سے پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی مصنف فسانہ آزاد، جام سرشار اور سیر کہسار وغیرہ نے حسبِ فرمائش جناب مالک مطبع اودھ اخبار کی باکمال فصاحت اور بلاغت اردو میں ترجمہ بار دوم مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے ۱۹۰۳ء طبع ہوا۔

۲۸۔ اودھ اخبار، ۵/ جنوری ۱۸۸۰

۲۹۔ پک وک کے ناول سے مراد چارلس ڈکنس (Charles Dickens۔ ۱۸۱۲ء-۱۸۷۰ء) کا ناول *Pickwick Papers* ہے جو ۱۸۳۶ء سے ۱۸۳۷ء کے دوران قسط وار شائع ہوا اور کتابی شکل میں ۱۸۳۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

۳۰۔ والٹر یعنی سر والٹر اسکاٹ (۱۷۷۱ء-۱۸۳۲ء): ان کے ناول کلاسیک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے اہم ناول *The Fair Maid of Perth* (۱۸۲۸ء)، *The Atiquary* (۱۸۱۷ء)، *Roby Roy* (۱۸۲۶ء)، اور *The Wood Stock* (۱۸۲۶ء) ہیں۔

۳۱۔ مانٹی کرسٹو کا پورا عنوان *The Count of Monte Cristo* ہے اور اس کے مصنف الیکزنڈر ڈیوما (Alexandare Dumas۔ ۱۸۰۲ء-۱۸۷۰ء) ہیں۔

۳۲۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد چہارم، آٹھواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۶۲ء)، ۲۳۰۔

۳۳۔ خورشید الاسلام، تنقیدیں (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۷۵ء)، ۷۶۔

۳۴۔ خورشید الاسلام، تنقیدیں، ۷۹۔

۳۵۔ احتشام حسین، ادب اور سماج (بمبئی: کتب پبلیشر لمیٹڈ، بار اول، ۱۹۴۸ء)، ۸۸۔

۳۶۔ فیض احمد فیض، میزان (کراچی: اردو اکادمی سندھ، جدید ایڈیشن، ۱۹۷۸ء)، ۲۱۷۔

۳۷۔ فیض احمد فیض، میزان، ۲۲۰۔

۳۸۔ فیض احمد فیض، میزان، ۲۲۱۔

۳۹۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد دوم، ساتواں ایڈیشن (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۹۰ء)، ۹۔

۴۰۔ اودھ اخبار مورخہ ۱۵/ مئی ۱۸۸۶۔

۴۱۔ جام سرشار کے سرورق پر لکھا ہے "جام سرشار، درایزی خامہ گہربار، پنڈت رتن ناتھ صاحب در لکھنوی متخلص بہ سرشار مصنف فسانہ آزاد وشمس

الضحیٰ، سیر کہسار، اور ترجمہ اعمال نامہ روسیہ وغیرہ، جو حسب الایمائے منشی نولکشور صاحب، سی آئی ای مرحوم تصنیف ہوا تھا"، ماہ ستمبر ۱۹۰۰ء۔

۴۲۔ رتن ناتھ سرشار، جام سرشار (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۰۰ء)، ۲۔

۴۳۔ آل احمد سرور، تنقیدی اشارے (علی گڑھ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۴۲ء)، ۷۸۔

۴۴۔ رتن ناتھ سرشار، خدائی فوجدار (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۹۰۰ء)، ۲۔

۴۵۔ فیروز حسین، "Life and works of Rattan Nath Sarshar"، غیر مطبوعہ تھیسیز برائے حصولِ ڈگری، پی ایچ۔ڈی، ۷۔

۴۶۔ ڈی میکنزی ویلس[D. Mackenize Wallace۔۱۸۲۶ء-۱۹۰۲ء] اسکاٹ لینڈ کے مصنف، صحافی اور سول سرونٹ تھے، ان کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب *Russia* کو Casell and Company Limited London نے شائع کیا۔

۴۷۔ رتن ناتھ سرشار، اعمال نامہ روس (لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۷۸ء)، ۱۰۔

اصل متن:

When I first formed the project of bringing about a translation of this book. I was in some doubt so to who would be the best person to be employed as translator. Finally decided on ..... entrusting this task to Pt. Rattan Nath Sarshar connected with the Oudh Akbar and I am glad to find that this translator has been approved by competent Judges.

۴۸۔ عبدالرشید صدیقی، پنڈت رتن ناتھ سرشار کے تراجم: ایک تنقیدی جائزہ، ۹۵۔

۴۹۔ فیروز حسین، "Life and works of Rattan Nath Sarshar"، غیر مطبوعہ تھیسیز برائے حصولِ ڈگری، پی ایچ۔ڈی، ۳۴۷۔

۵۰۔ رتن ناتھ سرشار، خدائی فوجدار، ۲۔

۵۱۔ فیروز حسین، "Life and works of Rattan Nath Sarshar"، غیر مطبوعہ تھیسیز برائے حصولِ ڈگری، پی ایچ۔ڈی، ۳۵۴۔

Bibliography

Ashk, Prem Pāl. *Paṇḍit Ratan Nāth Sarshār: Ḥayāt, Shakhṣiyat aur Kārnāmē*. Delhi: Taraqqī Urdu Bureau, 1982.

Dar, Bishan Narayan. "Ratan Nath: A Study." *Hindustani Review*. Ed. S. Sinha. 1904.

Faiz, Faiz Aḥmad. *Mīzān*. Karachi: Urdū Academy Sindh, 1978.

Hussain, Firoz. *Life and Works of Rattan Nath Sarshar*. PhD diss., University of London, School of Oriental and African Studies, July 1964.

Hussain, Sayyid Laṯīf. *Ratan Nāth Sarshār kī Nāwalnigārī*. Karachi: Anjuman Taraqqī Urdū, 1961.

Islam, Khurshīd. *Tanqīdeṇ*. Aligarh: Anjuman Taraqqī Urdū Hind, 1975.

Raēs, Qamar. *Ratan Nāth Sarshār* (Monograph). Delhi: Sāhitya Akademi, 1982.

Ṣiddīqī, ʿAbd al-Rashīd. *Paṇḍit Ratan Nāth Sarshār kē Tarājim*. Aligarh: Ṣabā Printing Works, 1977.

____. *Paṇḍit Ratan Nāth Sarshār kē Tarājim: Ek Tanqīdī Jāʾizah*. Sandhah, Dist. Ambedkar Nagar, U.P.: Self-published, 1997.

Sarshār, Ratan Nāth. *Aʿmāl Nāmah-i Rūs*. Lucknow: Munshī Nawlkishor Press, 1878.

_____ . *Don Quixote*. 2nd ed. Lucknow: Munshī Nawlkishor Press, 1903. *(Originally: Cervantes, 1605 & 1615)*

_____ . *Fasānah-yi Āzād*, Vol. 1. 8th ed. Lucknow: Munshī Nawlkishor Press, 1923.

Sarwar, Āl Aḥmad. *Tanqīdī Ishārē*. Aligarh: All India Muslim Educational Conference, 1942.

Ṣiddīqī, ʿAbd al-Rashīd. *Paṇḍit Ratan Nāth Sarshār kē Tarājim: Ek Tanqīdī Jāʾizah*. Sandhah: Self-published, 1997.

Ṣiddīqī, Iḥtishām Ḥusain. *Ādab āur Samāj*. Bombay: Kutub Publishers Ltd., 1948.